مولانا محمد حسین آزادؔ کے مضمون "سیر زندگی" کا اسلوبیاتی جائزہ

(A Stylistic Review of Maulana Muhammad Hussain Azad's Essay "Sair-e-Zindagi")

DOI: https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2024.08012138**

اسامہ منور

Usama Munawar
Ph.D Scholar, Department of Urdu
Muslim Youth University, Islamabad

ڈاکٹر محمد عارف فرہاد

Dr Muhammad Arif Farhad
Head of Urdu Department
Muslim Youth University, Islamabad

Abstract:
Maulana Muhammad Hussain Azad's essay "Sair-e-Zindagi" describes life and its different stages. The essay starts with the words of a sage that when a person comes into the world, he is completely ignorant and innocent. Then there is childhood, which he finds in the form of a beautiful and carefree life, and then there is youth, which is a beautiful, exciting and colorful period of life, and it is full of emotions and desires. After that, gradually the organs of a person start to decay and he moves from youth to old age. By going to old age, he becomes greedier about life. A critical review of the said essay is presented in this article highlighting the characteristics pertaining to style and diction of the writer.

Keywords:
Maulana Muhammad Hussain Azad, Nairang-e-Khayal, Sair-e-Zindagi, Stages of Life, Aab-e-Hayat, Urdu Literature, Urdu Prose, Literary Criticism.

شمس العلما آقائے اردو مولانا محمد حسین آزادؔ نامور نقاد، مورخ، تذکرہ نویس، شاعر اور انشا پرداز ۱۸۳۰ء میں دہلی میں مولوی باقر کے گھر پیدا ہوئے۔ مولوی باقر علی خود بھی نامور صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۶ء میں دہلی

سے "اردو اخبار" جاری کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریز حکومت نے انھیں سزائے موت دے دی۔ مولوی باقر علی عالم دین تھے اس لیے مولانا محمد حسین آزادؔ کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ ان کے جد امجد مولوی محمد اکبر نے مولانا آزاد کو ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ اس کے بعد مولانا آزادؔ نے قدیم دلی کالج میں داخلہ لیا۔ وہ شاعری میں ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ان کے والد کو پھانسی دے دی گئی، گھر بار لٹ گیا۔ یہ اپنی جان بچا کر لکھنؤ گئے۔ وہاں سے پنجاب آئے اور محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس کے بعد انھوں نے محکمہ تعلیم میں ملازمت کی اور ساتھ ساتھ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہے اور ابتدائی جماعتوں کے لیے درسی کتابیں بھی تصنیف کرتے رہے۔ کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں "انجمن پنجاب" کے مشاعروں کے ذریعے جدید اُردو شاعری کی بنیاد رکھی، مختلف ممالک کا سفر بھی کیا۔ وہ ۱۸۹۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ عمر کا آخری حصہ بیماری اور جنوں میں گزرا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

آزادؔ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ انھوں نے جدید شاعری کی بنیاد رکھی، تاریخ نویسی، ادبی اور تنقید نگاری کا ڈول ڈالا اور انشا پردازی کے ذریعے اردو نثر میں شاعرانہ تخیل، آہنگ، دلکشی و رعنائی، حسن و عظمت اور جدت پیدا کی ان کی مشہور تصانیف میں دربار اکبری، سخندانِ فارس، آبِ حیات اور نیرنگ خیال قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری میں "نظم آزاد" ان کا تخلیقی سرمایہ ہے۔ مولانا آزاد کی عظمت بیان کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد حسین آزادؔ اردو کے ان سدا بہار ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریروں کو خزاں کا اندیشہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی تازگی ہمیشہ قائم رہے گی۔"(۱)

اس میں کچھ شک نہیں کہ آزادؔ کا شمار اردو کے ارکان خمسہ میں ہوتا ہے۔ دراصل ان کا حقیقی کارنامہ ان کی انشا پردازی ہے۔ وہ ایک منفرد طرز ادا اور طرز خاص کے نثار ہیں۔ انشا پردازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو نئے اسلوب سے روشناس کروایا۔ ان کے طرز تحریر میں زبان کی سادگی، تخیل کی بلندی صنائع و بدائع کا بر محل استعمال، تصویر کشی، پیکر تراشی اور رعایت لفظی اہم خصوصیات ہیں۔ بقول آغا محمد باقر:

> "اردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں اور بلند ہے۔ وہ طرزِ جدید کے بانی، فطری شاعروں کے پیش رو، فارسی کے سکالر، قدیم و جدید رنگ کے ماہر، ماہرِ تعلیم، اعلیٰ مضمون نگار، زبردست ناقد، اردو فارسی کی کتابوں کے مشہور و معروف مصنف اور اپنے زمانے کے عدیم المثال مقرر تھے۔"(۲)

مولانا آزاد الفاظ کا انتخاب بڑی عمدگی سے کرتے ہیں اور الفاظ پر پوری حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ وہ زبان کی

شیرینی، محاورات کی صحت، تشبیہات و استعارات کی گل کاری سے عبارت کو مزین کرتے ہیں اور تخیل و تصور کی بلندی سے قاری کو جہانِ دیگر میں لے جاتے ہیں۔ تمثیل اور استعارے پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ "نیرنگ خیال" کو تصنیف کرنے میں مولانا آزادؔ نے پانچ سال صرف کیے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے اس کا پہلا حصہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا اور دوسرا حصہ مولانا آزادؔ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ آغاز میں یہ کتاب مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوئی مثلاً زبان اردو کے عنوان سے، اُردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیال وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوتے رہے مالک رام لکھتے ہیں:

> "آزادؔ نے یہ مضمون ۱۸۷۵ء میں لکھنا شروع کیے تھے۔ ان میں سے بعض انجمن عام قصور کے ماہانہ "پرچہ رسالہ" میں ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک کے متفرق شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ حصہ اوّل کی شکل میں ۱۸۸۰ میں شائع ہوا۔"(۳)

آزاد کے مضامین پر مشتمل معروف کتاب "نیرنگ خیال" دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ ان کی زندگی میں شائع ہوا، دوسرے حصے کی تکمیل کا ارادہ تھا مگر دماغی مرض کے سبب یہ ارادہ مکمل نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پوتے آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۳ء میں خود سے دیباچہ اور اختتامیہ لکھ کر دستیاب پانچ مضامین کو شائع کیا۔ "نیرنگ خیال" میں شامل مضامین دراصل انگریزی مضامین سے ترجمہ شدہ ہیں۔ یہ تراجم بھی مولانا آزادؔ کی تخلیقی قوت میں ڈھل کر محض تراجم نہیں رہے بلکہ آزادؔ کی ذہانت اور سحر بیانی کے ترمیم و اضافے نے انھیں طبع زاد تخلیق کے درجے پر فائز کر دیا ہے۔ اس کتاب میں کل تیرہ مضامین ہیں جن میں سے چھے مضامین جانسن کے ہیں، تین ایڈیشن کے اور بقیہ جن دوسرے انگریزی ادیبوں کے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

The endeavour of mankind roget rid of their burdens(Edison)

۲۔ شہرت عام بقائے دوام کا دربار

The vision of the Table of fame (Tatler, NO۸۱)

۳۔ خوش طبعی

Our ture and false homour (Johnson)

۴۔ آغاز آفرنیش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔

An allegorical history of rest and labour (Johnson)

۵۔ جھوٹ اور سچ کا رزم نامہ

Truth falsehood and fiction and allegery (Johnson)

۶۔ گلشنِ امید کی بہار

The garden of hope, a dream (Johnson)

۷۔ سیر زندگی

The voyage of life. (Johnson)

۸۔ علوم کی بد نصیبی

The conduct of Patronage (Johnson)

۹۔ علمیت اور ذکاوت کا مقابلہ

The allegory of wit and Learning (Johnson)

۱۰۔ نکتہ چینی

The allegory of Criticism (Addison)

۱۱۔ جنت الاحمقا

Paradise of fools (spectator No-۴۶۰)

۱۲۔ مرقع خوش بیانی

Addison, The spectator No.۵۰۱

"نیرنگ خیال" میں شامل مضامین انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ آزاد کی چابکدستی اور انشاپردازی کی مہارت نے انھیں تخلیقی رنگ دے دیا ہے۔ ان میں کچھ اس طرح کے حالات اور مقامی ماحول کے مطابق ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں کہ وہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ آزادؔ نے اردو نثر میں تمثیل نگاری کا آغاز اس وقت کیا جب اس قسم کے طرزِ تحریر سے اُکتا کر ادیب آگے بڑھ چکے تھے اور اس کی جگہ سادگی اور حقیقت نگاری نے لے لی تھی۔ اس عہد میں انسان عقل و فکر، تحقیق و تنقید کی روشنی میں آگے بڑھ گیا تھا۔ ویسے تو آزاد کی کوئی بھی تصنیف: تمثیل نگاری کے تخیل افروز اسلوب سے خالی نہیں لیکن ان کی طرز خاص کی نمائندہ تحریریں "نیرنگ خیال" میں ہیں۔ "نیرنگ خیال" میں آزاد کے تمثیلی پیرائیہ بیان نے جو جادو جگایا ہے۔ اس کی طرز انشا کا یہ رنگ کبھی پھیکا نہ پڑے گا۔ آزاد نے رمز و تمثیل کی ایک شکل پسند کی ہے اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے یعنی اشیائے بے جان اور اخلاق انسانی مجسم کر کے اپنے افسانوں کے اشخاص و کردار پیدا کیے ہیں یہاں ہر جگہ عقل، دل، ایمان با النفس، انصاف، ظلم، ہمت، تخل، فرد، حوصلہ، صبر، محنت وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات دیکھ دیکھ کر اُکتاہٹ محسوس ہوتی ہے مگر آزادؔ نے اپنے خاص اسلوب بیان، ذہانت اور تخیل کے زور پر ان میں نئی نئی صورتیں پیدا کی ہیں۔ انھوں نے تمثیل کے پردے میں مذہب، اخلاق، علم و فن اور شعر و ادب کے نکات بڑی پرکاری اور مہارت سے پیش کیے ہیں۔ وہ مجرد خیالات کو متشکل اور مجسم صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کو انسانی خصوصیات سے آراستہ کر کے دکھایا ہے مثلاً آرام، مشقت، حرص، قناعت، سچ، جھوٹ، امید، یاس، بڑھاپا، بچپن اور علمیت وغیرہ کو انسانی پردے میں پیش کیا ہے۔

"نیرنگ خیال" کے مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب اول تا آخر نیرنگی خیالات کا سرچشمہ ہے۔ ظاہر ہے قاری کی نظر سب سے پہلے عنوانات پر پڑتی ہے۔ عنوانات دل چسپ ہوں تو آغاز ہی دلچسپی کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ قاری کے ذہن کے لیے مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عنوانات بھی اپنا کردار بہ خوبی نبھاتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً "آغاز آفرینش میں باغ عالم کا رنگ کیا تھا اور آہستہ آہستہ کیا ہو گیا"، علوم کی بد نصیبی، انسان کسی حال میں خوش نہیں، علمیت اور ذکاوت کا مقابلہ اور جھوٹ اور سچ کا رزم نامہ وغیرہ ان عنوانات کو دیکھتے ہی یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ آزادؔ کا مقصد ہی نیرنگی اور جدت پیدا کرنا تھا۔

نیرنگ خیال کا اسلوب شاعرانہ ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات کا خوب اور بر محل استعمال ملتا ہے۔ متونِ آزاد میں ایسی شعریت محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے شعر کو نثر میں لکھ دیا ہے یا وہ نثر میں شاعری کر رہے ہیں جس طرح شاعری میں ایک ایک لفظ کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے ویسے ہی مولانا آزادؔ اپنی نثر میں بہت چن چن کر الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس میں شعری وسائل کا بھی بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی تحریروں میں سحر کاری پیدا ہوئی جو قارئین کے دل میں اُترتی جاتی ہے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> "آزادؔ کی عبارت میں بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حسن کاری سب یک جان ہو گئی ہیں۔"(۴)

یہ آزادؔ کی عظمت ہے کہ وہ اس انوکھے اور نادر اُسلوب کے بانی ہیں جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی سادگی میں بھی بناؤ سنگھار کا سامان موجود ہے۔ اس معاملے میں انھیں یکتائی حاصل ہے۔ "نیرنگ خیال" کے مضامین انیسویں صدی عیسوی کے ربع ثالث کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی نیز معاشی منظر نامے کے عکاس ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات اسم با مسمیٰ ہیں اور ہندوستانی معاشرت کے تمام اوہام و خدشات کے پر آشوب دور کے ترجمان بھی ہیں۔ "نیرنگ خیال" کا مضمون "سیر زندگی" یہ جانسن کے انگریزی مضمون The voyage of life سے ماخوذ ہے۔ بیانیہ نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ آزادؔ کے جملہ رنگ جو اس کے اُسلوب کے نمائندہ ہیں اس مضمون میں مل جاتے ہیں۔ تخیل کی کار فرمائی تمثیل نگاری، مرقع نگاری، زندگی کی مختلف حالتوں کی اثر انگیز تصویریں بنانے میں آزادؔ نے فلسفیانہ تدبر سے کام لیا ہے۔ "سیر زندگی" نیرنگ خیال کے پہلے حصے کا ساتواں مضمون ہے اس کا آغاز ایک حکیم کے قول سے ہوتا ہے:

> "زندگی ایک میلہ ہے اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزارتی ہیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو نوجوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا دہی عطر ہے۔ بہت سے گرم و سرد زمانے کے دیکھتا ہے۔ نشیب و فراز

عالم کے طے کرتا ہے۔ بچپن سے لے کر ساری جوانی کے تجربوں میں گزارتا ہے جب گھس پس کر بڈھا ہوتا ہے تو ذرا آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ سکے۔"(۵)

مضمون کا عنوان "سیر زندگی" ہے۔ اسی عنوان کی مناسبت سے انھوں نے ایک حکیم کے قول سے آغاز کیا ہے کہ انسان دنیا میں آتا ہے تو بالکل بے خبر اور معصوم ہوتا ہے۔ پھر انسان کا بچپن ہے جو اسے ایک خوب صورت اور بے فکر زندگی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کے بعد عہد جوانی ہے جو زندگی کا خوب صورت، پر جوش اور رنگینی و رعنائی کا دور ہوتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انسان کے اعضا مضمحل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان جوانی سے بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور بڑھاپے میں جا کر وہ زندگی کے بارے میں مزید حریص ہو جاتا ہے۔ اس نے باقی زندگی غفلت میں گزاری ہوتی ہے۔ وہ بڑھاپے میں پہنچ کر بھی موت جیسی حقیقت کا سامنا کرنے کی بجائے خواب غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے دوست، ہم عمر اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہوتے ہیں مگر وہ موت کو بھول کر دنیا کی عیش و عشرت میں اس قدر کھو چکا ہوتا ہے کہ گویا اسے مرنا ہی نہ ہو اور پھر موت کا وقت آن پہنچتا ہے اور اس کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹتا ہے مگر اب چونکنے کا کیا فائدہ اسے اپنی زندگی کے اعمال کے موجب جزا و سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بنیادی طور پر اس مضمون کے ذریعے زندگی کی رعنائیوں اور دلکشیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو غالبؔ کے شعر کے مطابق اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے۔

موت ہی دراصل وہ محرک ہے جو انسانی زندگی میں رنگینی و رعنائی کا سبب ہوتا ہے۔ انسان زندگی میں نیکی بدی، اچھائی برائی سب دیکھتا ہے مگر دنیا میں اس قدر کھو چکا ہوتا ہے کہ وہ برائیوں کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا آزادؔ لکھتے ہیں:

"پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سبز ابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔"(۶)

زندگی کی خوب صورتی اسی میں ہوتی ہے کہ انسان اس سے ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لے۔ زندگی تو بہر طور انسان نے گزارنی ہوتی ہے چاہے وہ خوشی میں گزارے یا غم میں گزرے۔ اس مضمون میں زندگی کو ایسے میلے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس میں ہر انسان اپنے انجام کو بھلا کر اپنے حال میں مست نظر آتا ہے۔ آزادؔ نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

"سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر سنبھالے اور روک تھام سے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں اگر ہے تو اور ہم سفروں کو

ہے اوروں کے انجام دکھا رہے تھے اور اپنی بد انجامی نہ معلوم ہوئی تھی خود اسی مصیبت
میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب فوجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بد اعمالی
جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھی وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھی۔"(۷)

یہی وہ کیفیت ہے جو انسان کی غفلت کا پردہ چاک کرتی ہے کہ انسان زندگی میں اپنے انجام سے غافل ہو کر کسی طرح دنیا کی عیش و عشرت میں گم ہو جاتا ہے اگرچہ دنیا میں ان کے سامنے بہت سے نامور لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں مگر وہ محض خوابِ غفلت میں پڑا رہتا ہے کہ ابھی زندگی بہت پڑی ہے، ابھی میں نے بہت دیر تک زندہ رہتا ہے اور دوسروں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے دل کو جھوٹی تسلیوں سے بہلا کر انھی کاموں میں مصروف رہتا ہے جو بے کار کے ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں زندگی کے مختلف مدارج مثلاً بچپن، جوانی، بڑھاپا کی، مختلف کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی باطنی دنیا سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص کر بڑھاپے کی عمر میں انسان کسی قدر حریص ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد کی دنیا کے بھی احوال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آزادؔ نے موت کی اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ موت سے کسی کو قرار نہیں چاہیے وہ امیر ہے یا غریب، دولت مند ہے یا فقیر، جوان ہے یا بوڑھا، جب موت کا وقت مقررہ آئے گا تو کسی کی نہیں چلے گی اس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

"جب ان آفتوں کا باہم چرچہ ہوا تو جو مست غفلت زندگی گزار رہے تھے وہ بھی غمگین
ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلے نامردوں کو زندگی عذاب موت
ہو گئی بلکہ رنج و غم کے بعد جن راحتوں کی امید ہوتی ہے اس سے بالکل مایوس ہو گئے۔
مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس شرفت میں زیادہ خطرہ تھا وہی زیادہ تر بے پرواتھے
بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطرہ کا خیال دور ہی دور رہے۔"(۸)

دنیا میں جو لوگ دولت مند اور عیاش ہیں۔ وہ موت سے ڈرتے رہتے ہیں اور زیادہ خطرے کی حالت میں بھی یہی لوگ ہوتے ہیں چوں کہ ان کا مطمع نظر دنیا کی زندگی اور عیش و عشرت ہوتا ہے اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ وہ موت کا شکار ہو کر زندگی کی عیش و عشرت سے محروم ہو جائیں۔ وہ خواب غفلت میں پڑے رہتے ہیں اسی طبقے کو غفلت زیادہ ہوئی ہے بلکہ مرنے کے نام سے گھبرا جاتے ہیں اور اپنے مرنے کی بات سننے تک کو تیار نہیں ہوتے اور دنیا کی رنگ رلیوں، قصے کہانیوں، گیت، کھیل تماشوں سے اپنے دل کو بہلائے رکھتے ہیں مگر ان کی زندگی کی یہی بد اعتدالیاں انھیں بیماری، ہسپتال اور آخر کار موت کے منہ تک لے جاتی ہیں اور پھر کوئی انھیں بچانے والا نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کی نفاست اور غفلت موت کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتی ہے ان کی سب تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور آخر کار انھیں موت کا مزہ چکھنا پڑھتا ہے۔ مصنف نے اس مضمون کے آخر میں اس فکر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ دنیا عیش و عشرت کا گھر نہیں بلکہ ایک

امتحان گاہ ہے اور ہم یہاں امتحان دینے آئے ہیں لہٰذا ہمیں جس مقصد کے لیے زندگی دی گئی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محنت کرنی چاہیے نہ کہ غفلت میں زندگی گزار دیں۔ "سیر زندگی" میں زندگی کی حقیقت اور اس کے فانی ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، انسان کو غفلت میں زندگی نہیں گزارنی چاہیے اور کوئی بھی چیز اسے موت سے نہیں بچا سکتی لہٰذا انسان کو موت کی حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیے۔

"سیر زندگی" کا اسلوبیاتی جائزہ لینے کے لیے ہمیں "نیرنگ خیال" کے مجموعی اُسلوب کو سامنے رکھنا ہو گا چوں کہ اس کتاب میں شامل مضامین ایک ہی اسلوب کے حامل ہیں جس میں روانی، برجستگی اور شگفتگی ہے، اس سے کہیں بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ تخیل و رومان میں ڈوبی سطریں آزادؔ کی طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔ آزادؔ کی خیال آفرینی کا سرچشمہ انگریزی انشا پردازی سے پھوٹتا ہے تاہم آزاد کے تراجم کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے متخیلہ کو پابند سلاسل کرنے کی بجائے آزادی پرواز عطا کی اور "نیرنگ خیال" میں ایسی رنگین پناہ گاہیں تخلیق کیں جنھیں صرف وجدان کی داخلی نگاہ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ آزادی کی روحانیت رد عمل کی پیداوار نہیں بلکہ یہ ان کی اپنی افتادِ طبع کی نقیب معلوم ہوتی ہے۔ آزادؔ کا خاصہ یہ ہے کہ وہ مجرد خیالات کو محسوسات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جہاں سے وہ انسانی روپ دھار لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بشیر احمد لکھتے ہیں:

> "نیرنگ مضامین کا مطالعہ کیجیے تو صریحاً یہ معلوم ہو گا کہ آزاد کے خیالات میں رنگینی عمق اور وسعت ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو ادا کرتے وقت ندرت بیان، جدت، روانی اور جاذبیت کا خیال رکھا۔ زبان و بیان کی ان ہی خصوصیات کے حسن سنگم نے آزاد کے مضامین کو انشائیوں کے بہت قریب کر دیا ہے اور یہیں سے اردو انشائیہ نگاری کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔"(۹)

"نیرنگ خیال" مغرب کے نثری ادب سے اردو دان طبقے کو روشناس کروانے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ ان میں آزادؔ کا شوق ادب اور تخیل بھی بھرپور اپنے انداز میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں رہا بلکہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول:

> "اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ "نیرنگ خیال" کے بیش تر مضامین انگریزی ادب سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔ پھر بھی آزادؔ نے ان غیر ملکی بدیسی پھولوں کو اپنی رنگین انشا پردازی کی خوشبو سے کچھ اس طرح منور و معطر کیا ہے کہ غیر ملکی ساخت کے باوجود خالص ملکی چیز معلوم ہوتی ہے اور اگر تاریخی تحقیق کی تجسس آمیز مداخلت خوشہ چینی کے راز کو ظاہر نہ کر دے تو شاید کسی کو یہ سوجھ بھی نہ سکے کہ ان گل دستوں کے پھول

کسی دوسرے ملک کے خیابانوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔"(۱۰)

آزادؔ کی تحریروں میں شفق کی سرخی، صبحِ بہار کی دل آویزی، اور چاندنی کی لطافت ہے۔ ان کے اُسلوب کا خمیر صوفی کے تصور، شاعر کے تخیل، عاشق کی آرزو اور دوشیزہ کے ارمان کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں سادگی میں شوخی اور شوخی میں سادگی موجود ہے۔ اُسلوبِ نگارش کی قدرتی رنگینی اور دل آویزی نے "نیرنگ خیال" میں انسانی سیرت اور زندگی کے تجربوں کو حسین مرقعوں اور دلکش تصویروں میں بدل کر پیش کیا ہے۔ یہ بے خودی بھی ہے اور ہشیاری بھی۔ تشبیہات و استعارات ہیں مگر عام فہم اور دلکش ہیں۔ اُسلوبِ بیان کے معاملے میں آزادؔ کا نقطہ نظر بالکل واضح ہے وہ کتاب کو معمائے رفیق نہیں بناتا بلکہ معمائے رفیق بل کہ تفریح طبع بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ فن انشا میں لطف زبان کی شیرینی کو تفریح طبع کا سامان گردانتے ہیں ان کے شاعرانہ اسلوب کو دیکھتے ہوئے رام بابو سکسینہ نے ان کی نثر کو شاعری قرار دیا ہے۔

اُسلوب دراصل تحریر کی وہ روح ہے جو اپنی قوت حیات کی شدت کو منوا کر رہتی ہے۔ یہ درجہ دیگر لوازمات کے علاوہ شستہ اور برجستہ زبان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا - آزادؔ دہلی کے اشراف کے بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔ روزمرہ بھی آتا ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی عامیانہ عنصر اس میں شامل نہیں ہوتا۔ لفظوں کی مزاج دانی میں وہ ماہر ہیں۔ ان میں روزمرہ کا چٹخارہ پیدا کرتے اور سیدھے سادے روزمرہ کو علمی مرتبہ عطا کرنے کا کمال صرف انھیں آتا ہے۔

آزادؔ ایک طرف تو قدیم اسلوب کے بہترین اور نفیس ترین منعکس کرنے والے تھے اور ساتھ ہی ان کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ادبی نثر نگاروں کے جدید تقاضوں اور شعور کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ شعور بھی ان کے ذہین اور ان کی تخلیقی نثر نگاری سے ملا ہوا ہے۔ آزادؔ کی نثر فارسی اور اردو کی اعلیٰ ترین نثروں کا نچوڑ ہے۔ وہ مدعا اور مطلب مضمون کو براہ راست قاری تک پہنچانا نثر کا بنیادی مقصد سمجھتے ہے۔ یہ شعور بھی جدید نثر کا بخشا ہوا ہے کہ مدعا نگاری اولین درجہ رکھتی ہے اور رنگینی ثانوی درجہ پر۔ گویا آزادؔ ایسے سنگم پر کھڑے ہیں جہاں ایک نظر مشرق کی پوری پر تکلف انشا پردازی پر پڑتی ہے اور دوسری طرف نثر کے جدید تقاضوں پر۔ لہٰذا یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو کو انشا پردازی کے اعلیٰ درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزادؔ اور صرف آزادؔ ہیں۔ اردو میں آج تک آزاد جیسا مرقع نگار پیدا نہیں ہوا۔ آزادؔ کی فطرت میں منطق سے زیادہ جذبے اور تخیل کی کارفرمائی ملتی ہے اور تخیل کی رنگین تصویر کاری ہی ان کے اُسلوب کا وہ وصف خاص ہے جو رنگ آزادؔ کہلاتا ہے - تخیل کی تشکیل و تجسیم میں آزادؔ کا حسین بیان ان کے کام آیا ہے۔ آزادؔ کا بڑے سے بڑا معترض بھی ان کے غیر معمولی تخلیقی و فنکارانہ قوت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اور لفظوں میں تصویریں اتار دینے کا فن ان سے بہتر اُردو کے کسی بھی نثر نگار کو حاصل نہیں۔

"سیر زندگی" کے حوالے سے آزادی کا اُسلوب دیکھا جائے تو یہ ایک اخلاقی تمثیل ہے۔ اس میں انھوں نے دنیا کو غیر معمولی انداز سے بیان کیا ہے۔ انسان کو زندگی کے حقائق کے نفسیاتی تجزیے سے آگاہ کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی حقیقت اور اس کے تمام نشیب و فراز کو بڑی عمدگی سے سمجھانے کی سعی کی ہے۔ وہ زندگی کو بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں تقسیم کر کے فلسفیانہ انداز میں سمجھاتے ہیں۔ انسانی زندگی کا آخری درجہ بڑھاپا جو صحیح حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسان بڑھاپے میں بھی دنیاوی لذتوں سے سیر نہیں ہوتا۔ اس کا دل دنیاوی لذتوں سے بھرتا نہیں ہے۔ انسانی فطرت میں عمر میں یوں حریص ہو جاتی ہے کہ دینے کی بجائے لینے کی خواہشیں زور پکڑ جاتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی اشیا کے حصول کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

اسی طرح آزادؔ نے اس مضمون میں زندگی کے سنہرے دور بچپن کا بڑی عمدگی سے اظہار کیا ہے۔ بچپن کا دور بڑا سیانا ہوتا ہے اس دور میں احساس زندگی نہیں ہوتا۔ رنج و غم، جھوٹ و سچ سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس دور میں سوائے خوشی کے کچھ نہیں سوجھتا۔ جوانی آئی دنیا خوش نما باغ دکھائی دیتی ہے اور اسے عیش و عشرت کا باغ سمجھ کر سنہرے خواب دکھائی دیتے ہیں لیکن جب خواب ٹوٹتا ہے تو سامنے بڑھاپا نظر آنے لگتا ہے جسے دیکھ کر انسان کانپ اٹھتا ہے مگر جو لوگ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھتے ہیں وہ جوانی کو اپنی زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرتے ہیں۔ بچپن، جوانی، بڑھاپے کے مختلف مدارج کو اس مضمون میں ڈرامائی شکل دے کر آزادؔ نے ہماری سماجی آفرینش کا مفہوم، مقاصد اور اغراض کو شستہ اور سلیس زبان میں بیان کیا ہے۔ خیالات کے بلیغ اور فکر بالیدہ سے اس مضمون میں انھوں نے بہت سادہ انداز میں یہ نتیجتاً پیش کیا ہے کہ صرف مادی ضرورتوں کی تسکین ایک اعلیٰ انسان کا منصب نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی مادی لذتیں عارضی ہوتی ہیں اور ان ضرورتوں کی طرف بھاگنے والا انسان اصل مقصد حیات سے غافل رہ جاتا ہے۔ آزادؔ نے "سیر زندگی" میں یہ اخلاقی درس دیا جو کرداروں اور رقصوں کے ذریعے اخلاقی باتوں کو بڑے موثر انداز میں قاری تک پہنچاتا ہے۔ دراصل یہ مضمون مادی اور روحانی زندگی کے فلسفے کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ مادی اشیا عارضی ہیں اور اصل چیز روح کی بالیدگی ہے۔ انسان کو دنیا کی زندگی میں مادی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ روحانی بالیدگی پر بھی توجہ دینی چاہیے ورنہ اس کی زندگی کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔

حوالہ جات

۱۔ مالک رام، نیرنگ خیال اول دوم، نئی دہلی: لبرٹی آرٹس پریس، ۱۹۸۷ء، ص:۱۶

۲۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم و نثر اردو، لاہور: ۱۹۴۴ء، ص:۱۶۹

۳۔ مالک رام، نیرنگ خیال، ص:۲۰

۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص:۴۶۹

۵۔ محمد حسین آزاد، نیرنگ خیال، لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ، ۲۰۱۰ء، ص:۴۲

۶۔ ایضاً، ص:۴۸

۷۔ ایضاً، ص:۵۰

۸۔ ایضاً، ص:۵۲

۹۔ بشیر احمد، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، لاہور: نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۰۴

۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میرا من سے عبدالحق تک، طبع دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ، ۲۰۰۵ء، ص:۲۳۱